اورینٹل کالج میگزین، جلد۹۹، شمارا، مسلسل شمارہ:۳۷۱، سال ۲۰۲۴ء

داغ دہلوی: زُبان شناس، البیلا شاعر: ایک جائزہ

محمد محسن خالد
لیکچرار اُردو
گورنمنٹ شاہ حسین ایسوسی ایٹ کالج چوہنگ، لاہور

AN OVERVIEW OF DAGH DEHLVI LINGUISTIC DANDEY POET

Muhammad Mohsin Khalid
Lecturer in Urdu
Govt. Shah Hussain Associate College Chung, Lahore

Abstract

Mirza Dagh Dehlvi enjoys a unique place in Urdu literature. The message of universalism in his poetry combined with his philosophical approach grant him a stature that has yet to be achieved by any other Urdu poet. In this article, an effort is being made to give an overview of Dagh poetry, examining it by different yardsticks. The purpose is to highlight the salient characteristics of his personality as well as those of his poetry. The dominant characteristic of his poetry is his logical style of narration. His poetry contains unparalleled pieces of imagination. The use of words shows a great command of language. It is hard to decide whether Mirza Dagh became great for writing his ghazals or if Urdu ghazals were honoured to have a poet like him. There is no doubt that he is the brightest moon in the galaxy of classical Urdu ghazals.

Keywords:
Urdu, Litrature, Classic, Ghazl, Dnady, Linguistic, Art, Poetics, Versatile, Romentic, Persion Poetic Tradition.

کلاسیکی غزل اپنے دامن میں ایسے گنج ہائے گراں مایہ رکھتی ہے جسے ورق ورق دیکھنے کا اپنا ہی مزہ ہے۔ کلاسیکی غزل میں مرزاداغ (۱۸۳۱۔۱۹۰۵ء) کا وجود جہاں نیک بختی کی علامت ہے وہاں اُردو زبان کے دامن کو اپنی تنگ دامانی کے احساس سے نجات کا ایک سہارا بھی ہے۔ مرزاداغ نے دہلی کے شعری روایت کو اپنے خاص اُسلوب سے متاثر کیا ہے۔

مرزاداغ خان کے آباو اجداد بلخ و بخارا کی ریاست سے تعلق رکھتے تھے۔ اس زمانے میں چوں کہ بارڈر سسٹم اور اس طرح کی سفری پابندیاں نہ تھیں۔ لوگ روزگار اور لوٹ مار کے خوف سے ہجرت کو اپنا مشغلہ سمجھتے تھے۔ سفر کو وسیلہ سفر سمجھا جاتا تھا۔ داغ کے اسلاف کا اصل وطن بخارا تھا۔ حالات کی ناسازگاری سے بلخ میں سکونت اختیار کرلی۔ ڈاکٹر خلیق انجم (۱۹۳۵۔۲۰۱۶ء) لکھتے ہیں:

> ”چھٹی صدی ہجری میں ساداتِ علوی میں سے ایک بزرگ خواجہ احمد مشہور ولی اللہ گزرے ہیں۔ ان کی اُولاد میں سے خواجہ عبدالرحمن، بلخ میں منتظم دیہات اور دارالضرب شاہی رہے۔ ان صاحب کی نسبت داغ کے داد کی طرف کی جاتی ہے۔“(۱)

داغ کے والد نواب شمس الدین خاں (۱۸۳۵ء) کے ہاتھوں ایک انگریز ولیم فریزر (۱۷۸۴۔۱۸۳۵ء) کے قتل اور اس کی پاداش میں پھانسی کی سزا نے ان کی والدہ وزیر بیگم (۱۸۸۲ء) کی زندگی اجیرن کر دی۔ داغ کی والدہ چوں کہ اپنے حُسن و جمال کا شہرہ رکھتی تھیں۔ اس وصف کے پیشِ نظر نوابین و روٴسا نے ان سے نکاح کے اصرار کو ایک اذیت ناک صورت حال میں بدل ڈالا۔ وزیر بیگم کی قسمت نے انھیں کسی ایک رفیق کی تاحیات رفاقت نصیب نہ ہونے دی۔ نواب شمس الدین کے بعد، نورخان، آغا ابو تراب اور مرزا فخرو (۱۸۱۶۔۱۸۵۶ء) کی معیت میں آنے کے بعد لال قلعہ میں شوکت محل کی زینت بن گئیں۔

داغ کے والد کی بہ جائے ان کی والدہ زیادہ معروف رہی ہیں کیوں کہ داغ کی شخصیت پر ان کی والدہ کے اثرات زیادہ گہرے پڑے۔ داغ کی والدہ وزیر بیگم عرف چھوٹی بیگم ایک کشمیری سادہ کار یوسف (۱۷۹۱۔۱۸۶۹ء) کی چھوٹی بیٹی تھیں۔ ان کی شادی بارہ برس کی عمر میں نواب شمس الدین خاں سے ہوئی۔ ۱۸۳۱ء میں داغ کی ولادت دہلی کے چاندنی چوک میں ہوئی۔ تمکین کاظمی (۱۹۰۲۔۱۹۶۱ء) داغ کے بچپن کے حوالے سے لکھتے ہیں:

”جب شمس الدین احمد خان کو پھانسی دی گئی اور ان کی جائیداد ضبط ہونے لگی تو انگریزوں نے اس مکان کی بھی تلاشی لی اور غریب بیوہ اپنے کمسن لڑکے کو لے کر نکل کھڑی ہوئی۔ یتیم داغ پر ان کی خالہ کا دل بھر آیا اور انھوں نے اپنے ہاں رکھ لیا۔“(۲)

مرزا فخرو سے نکاح کے بعد داغ کی والدہ کی رسائی قلعہ معلیٰ میں ہو گئی جہاں داغ کی باقاعدہ تعلیم وتربیت کا آغاز ہوا۔ اگرچہ تعلیم کا سلسلہ اس سے پہلے شروع ہو چکا تھا۔ رام پور میں مولوی غیاث الدین سے فارسی کی درسی کتابیں پڑھیں تھیں تاہم قلعہ معلیٰ میں مقیم ہونے کے بعد مولوی سید احمد حسین سے زانوائے تلمذ طے کیا۔ فارسی وعربی کی مروجہ تمام کتب کا گیان وافہام حاصل کیا۔

ذوق (۱۷۹۰۔۱۸۵۴ء) سے دیرینہ رفاقت نے داغ کو ایک پختہ اور رومان انگیز شاعر بنا دیا۔ زبان وبیان کے جملہ اوصاف سے متصف مرزا محمد خان نواب داغ کے لقب سے مقلب ہو کر چہار عالم معروف ہو گئے۔

بعد اُستاد ذوقؔ کے کیا کیا شہرت افزا کلام داغؔ ہوا (۳)

شاعری کا ذوق ورثے میں نہیں ملا تھا تاہم داغ نے اپنی جودتِ طبع اور خیالات کی نزاکت آفرینی کو شعری پیکر میں ڈھالنے کا سلیقہ بہت جلد سیکھ لیا اور اس میں تاک ہو گئے۔ چند برس ذوقؔ کی رفاقت نے داغ کو جانب واطراف میں لائق توجہ بنا دیا اور داغ کی باقاعدہ مشاعروں میں شرکت یقینی ہو گئی۔ مرزا داغؔ نے سب سے پہلے نواب مصطفی خاں شیفتہؔ (۱۸۰۹۔۱۹۶۹ء) کے مشاعرے میں شرکت اور حسب ذیل مطلع سے غزل کا آغاز کیا:

شرر وبرق نہیں شعلہ وسیماب نہیں کس لیے پھر یہ ٹھہرتا دلِ بیتاب نہیں (۴)

رفیق ماہروری (۱۹۸۰۔۱۹۶۷ء) زبانِ داغ کے مقدمہ میں لکھتے ہیں:

”مرزا صاحب فرماتے تھے کہ ایک بار محلہ زینت باڑی میں مشاعرہ ہوا۔ طرحی مصرعہ پر مولوی امام بخش ناسخ (۱۷۷۲۔۱۸۳۸ء) کے سامنے درج ذیل مقطع پڑھا: لگ گئی چپ تجھے اے داغِؔ حزیں کیوں ایسی مجھ کو کچھ خیال تو کمبخت بتا تو اپنا اس کو سنتے ہی آفرین صد آفرین کہتے ہوئے حضرت صہبائی اُٹھے اور فرحت محبت مجھے گلے لگا لیا۔“(۵)

مشاعروں میں شرکت کا سلسلہ تاحیات رہا۔ داغ نے مشاعروں میں یکساں مقبولیت اور داد وصول کی جو ایک شاعر کی حیات کا سرمایہ افتخار ہے۔ ایسے ماحول میں جس شخص کی تربیت ہو گی۔ اس کی

شخصیت میں اس جنس آمیز رومانی اجزا کا فعال ہونا اچنبھے کی بات نہ تھا۔ داغ کی شاعری میں ان نفسانی و معاملہ بندی عناصر کی کثرت کو جابہ جا محسوس کیا جا سکتا ہے۔ ڈاکٹر شوکت سبز واری (۱۹۸۰۔۱۹۷۳ء) لکھتے ہیں:

> " داغ کی بچپن اور جوانی کا زمانہ زیادہ تر قلعہ معلی یعنی لال قلعہ میں گزرا ہے۔ بادشاہ زادوں کے ساتھ رہ کر ان کی اُسی پیمانے پر تربیت اور پرورش ہوئی۔ ان کی تربیت میں کوئی کسر نہ چھوڑی گئی۔ داغ کی شخصیت پر قلعہ معلّٰی کے ماحول، اطوار، اندازِ زیست اور طرزِ آدابِ معاشرت کا گہرا اثر ہے۔"(۶)

داغ کی پوری زندگی عیش و عشرت اور لہب و لعب میں گزری۔ حُسن و شباب، رنگ و سرورد کی محافل نے جہاں ان کی شخصیت پر گہرے اثرات مرتب کیے وہاں ان کی شاعری میں ان عناصر کا غلبہ غائر نظر آتا ہے۔ داغ کو ان وصائف کے پیشِ نظر حُسن پرست شاعر کہنے میں کوئی مضائقہ نہیں ہے۔ عیش و عشرت اور لہب و لعب سے وابستہ رہنے کے باوجود داغ نے شراب کو ہاتھ نہیں لگایا۔ دکن اور دہلی کے تماش بین محافل اور رؤسا کی موجودگی میں پیش کش کی دست یابی کو آسانی سے ٹھکرا دینا اتنا آسان نہیں مگر داغ کے ہاں یہ استقامت نظر آتی ہے۔

گو ہے عاشق مزاج و شاہد باز　　داغؔ لیکن شراب خوار نہیں(۷)

۱۸۵۷ء کا غدر جہاں انگریزوں کی عمل داری کا آغاز تھا وہاں سلطنت مغلیہ کا زوال بھی تھا۔ دہلی شہر لٹ کر ویران و برباد ہو گیا۔ ہر چیز عبرت کا نشان بن گئی۔ ایسے حالات میں داغؔ نے دہلی چھوڑ کر کہیں اور مسکنت ڈھونڈنے کی سبیل نکالی۔ بالآخر رام پور کو جائے قیام مناسب خیال کیا۔

دہلی کی تباہی اور بربادی گویا فصلِ خزاں تھی۔ جس طرح بہار کے خاتمہ پر باغ کی ساری رونقیں معدوم ہو جاتی ہیں؛ اسی طرح غدر کے بعد دہلی رنگ و باس سے محروم ہو گیا۔ ساکنانِ دہلی پر زمین تنگ کر دی گئی۔ سانس لینا دو بھر ہو گیا۔ اب یہاں کی زندگی میں وہ چٹخارہ اور ذائقہ باقی نہ رہا جو حیوانِ ناطق کو بھی اپنی جگہ سے ہلنے نہ دیتا تھا۔

رام پور کے مشاعروں میں امیر مینائی، داغ اور تسلیم وغیرہ ایسے جید شاعر طبع آزمائی کر چکے تھے۔ ان شعرا میں سے ہر ایک اپنی ذات میں گویا ایک دبستان تھا اور ممتاز شاعرانہ تعارف رکھتا تھا۔ داغ کی زبان، ان کا تخیل اور شاعری کا چلبلا رنگ رام پور کے عام و خاص کو ایسا بھایا کہ ان کے نام تا دیر ڈنکا بجتا رہا۔

مُنی حجاب بائی (و۔۱۸۹۱ء) سے داغ کے عشق کا تذکرہ ان کے سوانح نویس نے بڑے مزے لے لے کر کیا ہے۔ ۱۸۷۹ء میں بے نظیر باغ کے میلے میں حجاب بائی کو دیکھ کر داغ ان پر فریفتہ ہو گئے تھے۔ ملاقات کا سلسلہ چلا تو حجاب بائی کلکتہ چلی گئی اور داغ کفِ افسوس ملتے رہ گئے۔ داغ کی مُنی بائی سے محبت ووارفتگی نے انھیں خاصا بے چین کیے رکھا۔ نواب حیدر علی خان برادر نواب کلب علی خان (۱۸۳۴۔۱۸۸۷ء) نے داغ کی جنونی حالت کے پیشِ نظر کسی طرح حجاب بائی کو اپنے یہاں بلوا کر مقیم کروا لیا اور ملاقات کا سلسلہ ایک بار پھر شروع ہو گیا۔

جا کے عہدِ شباب کا آنا تھا دوبارہ حجاب کا آنا(۸)
پھر وہی ساعتِ سعید آئی کہ برس دن کے بعد عید آئی(۹)

داغ اور حجاب کے دوران ملاقاتوں کا سلسلہ گاہے بہ گاہے جاری رہا لیکن دونوں یک جان و یک قالب نہ ہو سکے۔ داغ نے رام پور میں اپنی تشنہ محبت کو **فریادِ داغ** مثنوی میں قلم بند کیا جو ان کے جذبات واحساسات کا مرقع اور حجاب بائی سے محبت وعقیدت کا منہ بولتا ثبوت۔ فکر و فن کے لحاظ سے یہ مثنوی داغ کا شاہ کار ہے۔ احسن مارہروی (۱۸۷۶۔۱۹۴۰ء) لکھتے ہیں:

> ”قیامِ رام کے دوران داغ کو والدہ کے انتقال کی خبر ملی جس نے انھیں انتہائی رنجیدہ اور ملول کر دیا۔ والدہ کی وفات کا صدمہ ان کے لیے ناقابلِ برداشت۔ والدہ کی وفات کے بعد داغ کو نواب کلب علی خاں کا سہارا تھا جو قدرت نے چھین لیا اور داغ کو زندگی سے جیسے نفرت سی ہو گئی تھے۔ مشاعروں اور محفلوں میں جانا موقوف ہو گیا۔ نواب کلب علی خاں کی وفات نے انھیں یاسیت کا شکار کر دیا اور یہ ہمیشہ کے لیے رام پور چھوڑ گئے۔“(۱۰)

رام پور چھوڑ دینے کے بعد داغؔ نے کئی جگہوں پر مقیم ہونے کی کوشش کی مگر کہیں کوئی ساز گار ماحول میسر نہ آ سکا۔ بالآخر حیدر آباد دکن مرزا داغؔ کے لیے سود مند ثابت ہوا۔ داغؔ کی شاعری کا چرچا ان کی آمد سے پہلے ہو چکا تھا۔ لوگ ان سے ملاقات اور شعر و سخن کی محافل کی زینت بننے کے متمنی تھے۔ احسن مارہروی مرزا داغؔ کی حیدر آباد آمد کے حوالے سے لکھتے ہیں کہ تمام شہر میں آپ کے آنے کی دُھوم مچی ہوئی تھی اور ہر ایک شوق بھرا دل آپ کا مشتاق تھا۔(۱۱)

حیدر آباد میں داغؔ نے طویل وقت گزارا اور زندگی کی کئی بہاریں دیکھیں۔ شاعری کا بیشتر حصہ اسی خطے میں تخلیق ہوا۔ داغؔ کی شعری اُٹھان میں اسی علاقے کی بو باس کا عمل دخل ہے۔ داغؔ کی شاعری

میں جہاں معشوقانہ اور معاملہ بند خیالات کا ذکر ملتا ہے وہاں زمانے کی سختیاں اور مصائب و آلائم کا ایک گہرا اثر بھی ان کی شاعری میں محسوس کیا جا سکتا ہے۔

حیدر آباد میں داغ کی موجودگی اُردو غزل کے فروغ کا سبب بنی۔ مشاعروں میں شرکت کے ساتھ شعرا کی تعداد میں اضافہ ہوتا رہا یہاں تک کے ہندوستان کے کسی اور شہر میں شعرا کی اس قدر بہتات اس سے پہلے دیکھنے میں نہ آئی۔ حیدر آباد میں انھیں اُستاد السلطان، ناظم یار جنگ، دبیر الملک، فصیح الدولہ جیسے خطابات سے نوازا گیا جو آپ کے اصلی نام کے مترادف بن گئے۔

ڈاکٹر جمیل جالبی (۱۹۲۹۔۲۰۱۹ء) لکھتے ہیں:

> "داغ دہلوی کی شاعرانہ پذیرائی کا سلسلہ نواب میر محبوب علی (۱۸۶۶۔۱۹۰۵ء) کی مصاحبت سے شروع ہوا۔ نظامِ دکن نے انھیں "بلبلِ ہندوستان، جہانِ اُستاد، دبیر الدولہ، ناظم جنگ بہادر" ایسی اعزازی خطابات سے نوازا۔ حیدر آباد میں داغ دہلوی کی عزت و قدر دانی مثالی ہے جو کسی اور دربار میں انھیں میسر نہ آسکی۔" (۱۲)

سر سید احمد خاں (۱۸۱۷۔۱۸۹۸ء) کی تحریک کے زیر اثر شعرا نے مغربی تہذیب کی کسی نے ستائش و پیروی اور کسی نے تنقیص و بے تعلقی ظاہر کی۔ داغ کے ہاں معاملہ اس کے برعکس رہا۔ داغ ایک مشرقی ذہنیت کے حامل انسان تھے۔ ان کے رویے اور رکھ رکھاؤ کی پرم پراہ میں مشرقی اقدار و رسوم کی پابندی عمر بھر نہ صرف جاری رہی بل کہ ان کے شاگردوں نے اس روش کو تادیر جاری رکھا۔

داغؔ نے جس طرح زندگی کو جیا۔ زندگی کے ہر زاویے کو دیکھا اور اسے شاعری کی زبان عطا کی۔ ہڈ بیتی کو جگ بیتی بنا دینے کا یہ انداز بہت کم شعرا کے ہاں ملتا ہے۔ داغؔ کی زندگی جس عیش و آرام میں گزری وہ روزِ روشن کی طرح عیاں ہے۔ اواخر عمر میں انسان کے قویٰ مضمحل ہو جاتے ہیں اور یہ وقت قریبِ مرگ سے منسوب کیا جاتا ہے۔ داغؔ بھی اواخر عمر میں انھیں آلام کا شکار ہوئے۔

بیماری کے زور نے ان کی حالت اجیرن کر دی تھی۔ قریبِ مرگ شدید جسمانی ضُعف نے مدافعتی نظام کو مضمحل کر دیا۔ جو آیا ہے اُس نے جانا ہے۔ قدرتِ حق نے ۱۹۰۵ء کا برس ان کے اگلے جہان میں منتقلی کا برس منتخب کر لیا۔ دہلی کے اس بانکے شاعر کی روح ہمیشہ ہمیشہ کے لیے دکن کی زمین سے عالم بالا کی طرف پرواز کر گئی۔ داغ نے اپنی موت کی تصدیق اس شعر میں پیشتر کر دی تھی:

آج راہی جہاں سے داغؔ ہوا   خانہ عشق بے چراغ ہوا (۱۳)

داغ کی موت معمولی موت نہ تھی بل کہ اُن کے مرنے سے ملک کا ایک باکمال شخص اُٹھ گیا۔ بزم سخن سے ایک ایسی جگہ خالی ہوئی جس کو ہنوز پُر نہیں کیا جاسکا۔ ڈاکٹر علامہ اقبال (۱۸۷۶۔۱۹۳۸ء) نے داغ کی کمی اور شاعرانہ خلا کا اظہار کچھ اس طرح الفاظ میں کیا:

چل بسا داغؔ آہ میت اُس کی زیبِ دوش ہے　　آخری شاعر جہان آباد کا خاموش ہے
تھی زبانِ داغؔ پر جو آرزو ہر دل میں ہے　　یعنی یہ لیلیٰ وہاں بے پردہ یاں محمل میں ہے
لکھی جائیں گی کتابِ دل کی تفسیریں بہت　　ہوں گی اے خوابِ جوانی تیری تعبیریں بہت (۱۴)

شاعر کے کلام کا اس کی زندگی میں مشہور ہو جانا باعثِ فخر امر ہے۔ داغؔ خوش نصیب ہیں۔ ان کی زندگی میں ہی ان کا کلام ہندوستان بھر میں پڑھا، سنا اور گایا جاتا تھا۔ داغ کی غزل خوانی کے بغیر اربابِ نشاط کی کوئی محفل مکمل نہ ہوتی تھی۔ شہرتِ کلام کے حوالے سے جو شہرت اور نام وری داغ کے حصے میں آئی وہ کسی اور شاعر کو ہنوز نصیب نہ ہوئی۔

مرزا داغ بنیادی طور غزل کے شاعر ہیں۔ ان کے ہاں غزل گوئی کا رجحان بچپن سے موجود تھا۔ یہی وجہ ہے کہ جب انھوں نے شاعری کی ابتدا کی تو بہت جلد اپنے فن کی اَوج کو جالیا۔ مرزا داغ کے کلام میں یوں تو دوسری اصناف سخن میں بھی طبع آزمائی برسرپیکار رہی لیکن ان کی شہرت کا تمام تر انحصار صنفِ غزل پر منحصر ہے۔ غزل گوئی کے میدان میں ان کے اُسلوب شعر کو جو مقام حاصل ہے۔ ان کے ہم عصر شعرا اس صفت سے محروم رہے۔ یہ اُسلوب اِن کا ذاتی ایجاد کردہ اور ناقابل تقلید ہے۔ اقبال جیسا آفاقی شاعر داغ کی زبان دانی اور معاملہ فہمی کا قدردان تھا۔

خیال کو موزوں کر کے شعر کے کینوس میں ڈھال لینے کا سلیقہ زبان کے رموز و علائم سے گہری واقفیت کے بغیر ممکن نہیں ہے۔ ایک بڑا شاعر اپنے اشعار میں متنوع الفاظ کا استعمال کرتا ہے جس میں ہر طرح کے ذہن کو متاثر کرنے کی صلاحیت موجود ہوتی ہے۔ محاکات کی باز آفرینی کو مرصع کرنے کا لائق تحسین ہنر بھی اس فن کی مشاقی کا بنیادی تقاضا ہے۔

مرزا داغ کی غزلیات کا بادی النظر جائزہ لیا جائے تو مذکورہ عناصر کی کارفرمائی واضح طور پر نظر آتی ہے۔ ساختگی و برجستگی، لطیف بندشیں، دل آویز مرقع کشی کے تمثیلی تراشوں کے ساتھ روزمرہ اور محاورات کا موزوں اور برمحل استعمال ایسی فنی خوبیاں ہیں جن سے داغ کا دیوان منقش و مرصع ہو گیا ہے۔

کلاسیکی غزل میں مشکل پسندی، دوراز کار مضامین اور سنگلاخ زمینوں کا استعمال؛ شعرا کی فنی لیاقت کا ثبوت تھا۔ یہ روایت صدیوں جاری رہی۔ شعرا نے خیال اور مضمون کے بر محل استعمال سے قطع نظر محض فنی بوقلمونیوں کے لفاظی پیکر تراشنے پر سارا زور صرف کیا۔اس کا فائدہ کم اور نقصان زیادہ ہوا۔ ڈاکٹر نورالحسن ہاشمی(۱۹۲۱۔۱۹۹۳ء) لکھتے ہیں:

> " شاہ نصیر دہلوی کی زبان شناسی سے کون واقف نہیں ہے۔ ان کی شاعرانہ طبیعت میں صناعی موجود تھی جس نے انھیں گنجلک مضامین سنگلاخ زمینوں میں باندھ لینے کا ہنر سکھایا۔ شاہ نصیر(۱۷۵۶۔۱۸۳۷ء) کا رنگ داغ کے برابر نظر آتا ہے لیکن محاورات کے معاملے میں داغ نصیر سے سبقت لیے ہوئے ہے۔ زبان پر داغ کا افتخار حق بجانب ہے۔"(۱۵)

داغ کی زبان کو لافانی بنانے میں دو باتیں بہت اہم ہیں۔ ایک تو اُستاد ذوق کی شاگردی اور دوسرے قلعہ معلّیٰ میں داغ کی پرورش۔ اُستاد ذوقؔ کو قصیدے کا ایک بڑا شاعر گردانا جاتا ہے۔ ان کی زبان دانی کے سبھی معترف ہیں۔ ذوق کو زبان و بیان پر جو دست رس حاصل تھی اس کا فائدہ داغ کو بہ راہ راست ہوا۔ نورالحسن ہاشمی لکھتے ہیں: "داغ کے یہاں زبان کا چٹخارہ محاورہ اور روزمرہ کی صفائی ذوقؔ کی وجہ سے ہے۔"(۱۶)

داغ کی زبان پر ذوقؔ کے اثرات بہت گہرے پڑے۔ زبان کی صفائی، روزمرہ اور محاورات کا برمحل استعمال داغ کو ذوقؔ کی بہ دولت نصیب ہوا۔ ذوقؔ نے اُردو زبان کو اپنی گود میں پالا تھا۔ ہونہار شاگرد نے آگے بڑھ کر نہ صرف اس کو سنبھالا بل کہ اس کے بال و بر خوب سنوارے اور لائق مثال بنادیا۔

مرزا داغ ۱۸۴۴ء میں لال قلعہ پہنچے تھے جہاں ۱۸۵۶ء سے غدر کے پیشِ نظر نکلنا پڑا۔ داغ نے زندگی کے بارہ سال اس قلعہ میں شاہ زادوں کے ساتھ گزارے۔ قلعہ معلّیٰ میں دلی کا ٹھیٹھ ٹکسالی لہجہ بولا جاتا تھا۔ اس سیدھی سادھی اور بامحاورہ زبان داغ کو اسی قلعہ سے نصیب ہوئی جس کا بھرپور اظہار انھوں نے اپنی شاعری میں کیا۔ ڈاکٹر اعجاز حسین(۱۸۹۸۔۱۹۷۵ء) لکھتے ہیں:

> "داغ کے والد کے معتوب ہو کر پھانسی چڑھنے کے بعد ان کی والدہ کے توسط سے ان کا بچپن قلعہ معلّیٰ میں گزرا جہاں اُردو زبان کا ٹھیٹھ لب و لہجہ اور آہنگ موجود تھا۔ اُستاد ابراہیم ذوق کی سرپرستی میں اُردو زبان میں مثالی دست رس داغ کی خوش بختی اور اُردو زبان کی معراج ٹھہری۔"(۱۷)

داغ نے اُردو زبان کی اہمیت و افادیت اور اس پر نازاں ہونے کا اظہار بہ کثرت اشعار میں کیا ہے۔

اُردو ہے جس کا نام ہمیں جانتے ہیں داغؔ　　سارے جہاں میں دُھوم ہماری زبان کی ہے(۱۸)
نہیں کھیل اے داغؔ یاروں سے کہہ دو　　کہ آتی ہے اردو زباں آتے آتے(۱۹)

داغ نے ساری زندگی اُردو زبان کی خدمت میں صرف کر دی۔ انھوں نے زبان کی صفائی و سادگی اور روزمرہ و محاورہ کے بر محل استعمال کو ہمیشہ دھیان میں رکھا الفاظ و محاورات کو سلیقے سے شعر میں مثلِ نگیں باندھا۔ داغ ہمیشہ اس بات کے لیے کوشاں رہے کہ دہلی کی شائستہ اور شُستہ زبان پورے ہندوستان میں پھیل جائے۔ ان کی یہ کوشش عمر بھر جاری رہی۔

داغ نے شاعری میں اُردو زبان کے علائم و رموز اور نزاکت و پُرکاری کا خیال نہیں رکھا بل کہ اپنی نشست و برخاست اور قیام و طعام کی نجی و درباری محافل میں بھی اس پر بحث کیا کرتے تھے۔ اپنے عزیزوں، دوستوں اور متعلمین کو اُردو زبان کی اہمیت و افادیت اور اس کی اصلاح و ترویج کے حوالے سے متحرک رہتے تھے۔ داغ نے اپنے متعدد خطوط میں شاگردوں کو زبان کے سلسلے میں اہلِ دہلی کے قلم کار کی تقلید کا مشورہ دیا۔ داغ کے نزدیک اہلِ دہلی اور اس کے قُرب و جوار کے لوگوں کی زبان ہی مستند اور قابل سند و تقلید ہے۔ ایک خط میں لکھتے ہیں:

> ”آپ نے مولانا راسخؔ صاحب (۱۷۴۸۔۱۸۲۳ء) کا جو شعر پیش کیا ہے میں اسے کسی صورت قبولنے کو تیار نہیں۔ خدا جانے وہ کس دُھن میں محو یہ شعر کہہ گئے ہیں۔ مولوی جی آپ کے مکرم ہیں۔ اب آپ خود ان سے استفسار کیجیے کہ آپ نے دہلی میں اس کے مستعمل ہونے کی سند کسی اور شاعر کے ہاں بھی دیکھی ہے یا خود کو اس کی سند ٹھہرالیا ہے۔ میرے نزدیک اس طرح کے الفاظ کا استعمال دہلوی کے نواحی قصبات میں رائج ہے۔ غور کیجیے کیا وہاں کے شُرفا یا عوام میں اس کا لفظ کا یوں استعمال ہوا ہے جیسا آپ نے شعر میں باندھ ڈالا۔(۲۰)

داغ نے اُردو زبان کو عام فہم بنانے میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ ان کی شاعری میں سادگی و سلاست اور روانی و برجستگی کا عُنصر فرواں و غالب نظر آتا ہے۔ انھوں نے اپنے اشعار میں عربی، فارسی کے بھاری بھر کم الفاظ و تراکیب سے ہر ممکن اجتناب برتا ہے۔ خیال کی ادائی کو لے کر جہاں تک ممکن ہوا؛ سادہ، سہل اور عام بول چال کا انداز موزوں کرنے کی شعوری کوشش کی۔ سادگی، سلاست، روانی اور عام بول چال کے حوالے سے ان کا کہنا ہے:

کہتے ہیں اسے زبانِ اُردو جس میں نہ ہو رنگ فارسی کا(۲۱)

داغ نے شعری زبان کی تراش خراش، لسانیاتی معاملات اور بیان و بدیع کے مباحث کو ملحوظ رکھا اور شاعری میں اس عنصر کا باقاعدہ خیال رکھا۔ جہاں تک ممکن ہوا مشکل اور دقیق الفاظ سے اجتناب برتا۔ مشکل زمینوں، تشبیہات واستعارات سے کلام کو مرصع کرنے کی کوشش نہ کی۔ اس انفرادیت کی وجہ سے کلامِ داغ کو میں خاص وعام میں یکساں شہرت و پذیرائی حاصل رہی۔ رام بابو سکسینہ (۱۸۹۶۔۱۹۵۷ء) لکھتے ہیں ”:انھوں نے سخت اور مغلق الفاظ ترک کر کے سیدھے سادے اور شیریں الفاظ اور محاورے اپنے کلام میں استعمال کیے جس سے کلام کی بے ساختگی اور فصاحت بڑھ گئی۔“(۲۲)

داغ کے عزیز شاگرد مولانا احسن ماہر وری کی پُراصرار خواہش پر داغ نے اپنے شاگردوں کے لیے ایک قطعہ زبان کی صحت وقطعیت کے حوالے سے موزوں کیا تھا جس میں اُردو زبان کے رموز و علائم اور شعر کے جملہ فنی محاسن کا ذکر کیا۔ احسن ماہر وری لکھتے ہیں:

> ”غزل کو داغ سے زیادہ اُردو زبان کو سلیس، رواں اور موزوں انداز میں کسی نے نہیں کہا۔ داغ نے اپنے زمانے کی مروج زبان کے جملہ اسالیب کو شعری پیراہن عطا کیا اور اس کی امکانی ترقی کو مزید عروج بخشا۔ داغ کی زبان دانی کا سکہ ان کے ہم عصر شعرا پر برابر اثر کیے ہوئے ہے۔“(۲۳)

چُپ رہوں میں تو رات جاتی ہے وہ جو بولیں تو بات جاتی ہے(۲۴)
جوش رحمت کے واسطے زاہد ہے ذرا سی گنہگاری شرط(۲۵)
داغؔ کہتے ہیں جسے دیکھیے وہ بیٹھے ہیں آپ کی جان سے دور آپ پہ مرنے والے(۲۶)

داغ کے کلام میں اس قبیل کے بہ کثرت اشعار موجود ہیں جن میں سلاست، روانی اور برجستگی پائی جاتی ہے۔ داغ کی شاعری میں محاکات کا طلسم جابہ جابکھرا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ طلسمی فضا کا ایک دبیز مگر لطیف احساس داغ کے اشعار میں نظر آتا ہے۔ داغ کو موزوں اور مناسب الفاظ کے استعمال میں یکساں قدرت حاصل ہے۔ الفاظ سے حکائی تصویریں بنانے کا فن داغ کے بائیں ہاتھ کا کام ہے۔ دیوان کو کھولیے اور شعر پڑھتے جایئے، شعر کیا ہیں گویا محاکاتی تصویریں ہیں جو اشعار کے کینوس پہ دوڑتی، مسکراتی، اٹھکیلیاں کرتی محوِ رقص ہیں۔

رُخِ روشن کے آگے شمع رکھ کر وہ یہ کہتے ہیں
ادھر جاتا ہے دیکھیں یا ادھر پروانہ آتا ہے(۲۷)

ترے وعدے کو بہت حیلہ جو قرار ہے نہ قیام ہے
کبھی شام ہے، کبھی صبح ہے، کبھی صبح ہے، کبھی شام ہے(۲۸)

حیا ت گر منہ چھپاتی ہے ادا پروہ اُٹھاتی ہے
یہ شوخی کب بٹھاتی ہے قیامت ہو ہی جاتی ہے(۲۹)

داغ کے کلام میں یوں تو ایک سے بڑھ کر ایک خصوصیت موجود ہے تاہم ایک فنی وصف جو بلاشرکت غیرے ان کا شعوری اختیا کردہ ہے وہ یہ کہ انھوں نے اشعار میں الفاظ کا استعمال اس طرح کیا ہے کہ شعر میں مکالمے کا لطف پیدا ہو جاتا ہے۔ زبان کی فصاحت، طبیعت کی شوخی اور مزاج کی بے تکلفی سوا ہو جاتی ہے جب خیال کی نزاکت جذبے کی شدت سے مملو ہو کر شعر کے کینوس میں ڈھل جاتا ہے۔

اِس نزاکت سے قول اُس نے دیا　　ہاتھ کی ہاتھ کو خبر نہ ہوئی(۳۰)
خدا کے واسطے جھوٹی نہ کھایئے قسمیں　　مجھے یقیں ہوا مجھ کو اعتبار آیا(۳۱)
شام ہونے تو دو، چلے جانا　　ہے ابھی تیز آفتاب بہت(۳۲)

محسن مجلس ۸۷

داغ کی زبان کو لے کر جہاں اور خوبیوں کا ذکر ملتا ہے وہاں ایک اور نمایاں وصف روزمرہ کا استعمال ہے۔ اُردو زبان اپنے دامن میں ایک وسیع ذخیرہ روزمرہ کا رکھتی ہے جسے نثر و نظم میں شعرا و ادبا برابر استعمال کرتے آئے ہیں۔ روزمرہ کا استعمال آسان نہیں ہے۔ شاعر کو جب تک اس میں دست رس اور قدرت حاصل نہ ہو، روزمرہ کا استعمال صحیح طریق پر ممکن نہیں ہے۔ داغ کی زبان کی ایک خوبی یہ ہے کہ ان کے ہاں روزمرہ کو جس سلیقہ اور فنی پختگی سے برتا گیا ہے، لائق داد ہے۔

داغ چوں کہ قلعہ معلیٰ میں رہے، دہلوی زبان کے ٹھیٹھ روزمرہ و محاورہ کا برمحل استعمال ان کی گھٹی میں پڑا تھا۔ اسی نسبت سے ان کی زبان متبدی کے لیے سند کی حیثیت رکھتی ہے۔ داغ نے زندگی کے تلخ و شیریں حقائق کو روزمرہ میں اس طرح کھپایا کہ شاعری کا لطف دوبالا اور مزاج کا رنگ دو آتشہ ہو گیا ہے۔

ناروا کہیئے ناسزا کہیئے　　کہیئے کہیئے مجھے بُرا کہیئے(۳۳)
عرض احوال کو گلہ سمجھے　　کیا کہا میں نے اور کیا سمجھے(۳۴)

شب وصال اُن کا یہ گھبرا کے کہنا　　　ہاتھ ٹوٹیں جو ہمیں ہاتھ لگائے کوئی(۳۵)

داغ کے کلام کی سب سے بڑی اور نمایاں خوبی محاورات کا بر محل استعمال ہے۔ داغ کا نام آتے ہی اُردو محاورات کی گونج سنائی دیتی ہے۔ داغ کے علاوہ محاورات کا ایسا رچاؤ ڈپٹی نذیر احمد کے ہاں پایا جاتا ہے۔ کلاسیکی غزل میں محاورات کا ایسا زبر دست اور بہ کثرت استعمال کسی اور شاعر کے ہاں بہت کم دیکھنے کو ملتا ہے۔

داغ کو بہ راہ راست قلعہ معلیٰ کے خالص ٹھیٹھ لب و لہجے میں پرورش پانے کا موقع ملا تھا۔ اُستاد ذوق کی شاگردی میسر آئی تھی جس نے داغ کی زبان دانی کے تمام نقص کو فنی مشاقی میں بدل دیا۔ مولانا حامد حسن قادری(۱۸۸۷ء-۱۹۶۴ء) لکھتے ہیں": انتخاب الفاظ، حُسن بندش، لطیف محاورہ، صفائی و روانی میں کسی اُردو شاعر سے کم نہیں۔ (داغ یقینا) اپنے زمانے میں بے نظیر ہیں۔" (۳۶)

داغ کی غزل کا مطالعہ کرنے سے یہ بات مزید واضح ہو جاتی ہے کہ داغ نے زبان کے معاملے میں کبھی غفلت سے کام نہیں لیا۔ ایک ایک شعر میں روز مرہ و محاورہ اس خوبی اور سلیقے سے باندھا گیا، گویا موتی ہوں اور لڑی میں پُرو دیے ہیں۔ دہلی کی ٹکسالی زبان پر داغ کو جس قدر قدرت حاصل ہے یہ کسی اور شاعر کے حصے میں نہیں آئی۔ داغ کی زبان متاخرین کے لیے مستند زبان کی سند کا درجہ اختیار کر گئی ہے۔ ڈاکٹر شوکت سبز واری لکھتے ہیں:

> "داغ نے دہلی کی ٹکسالی زبان استعمال کی جس میں لاکھوں بناؤ کے باوجود ایک طرح کا الھڑ پن ہے۔ داغ دہلی کے تھے اور دہلی کی زبان پر مٹے ہوئے تھے۔"(۳۷)

بہ طور نمونہ یہ شعر دیکھیں:

وہ تکلیف عیادت کیوں کریں داغؔ　　　مری ان کو خبر جائے تو اچھا(۳۸)

وہ آئیں شب وعدہ یقین نہیں اے دل　　　چراغ گھی کے جلاؤں یہ ایسی شام نہیں(۳۹)

مے تو حلال ہے جو پیئے ڈھب سے بادہ نوش　　　میں توبہ کر کے اور پشیمان ہو گیا(۴۰)

محاورات کے اس قدر کثرتِ استعمال سے داغ کی اُردو زبان سے محبت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ داغ نے محاورات کے استعمال میں ہمیشہ اس بات کا خیال رکھا کہ محاورے کو اس طرح استعمال ہونا چاہیے جیسے کہ وہ روز مرہ کی گفت گو میں بولے جاتے ہیں۔ جن اشعار میں داغ نے محاوروں کا استعمال کیا ہے وہ نہایت دل کش، دل آویز اور زبان کے جملہ محاسن سے معمور ہیں۔ محاورات کے استعمال میں داغ نے

موزونیت، توازن کے ساتھ ترنم و آہنگ کا بھی خیال بھی رکھا ہے تا کہ محاورے کا حُسن اور خیال کی کشش دونوں شعر کے ایجاز کو لائق داد بنا دے۔

دیکھنا رشک اُس کی محفل میں   ایک کو ایک کھائے جاتا ہے(۴۱)

دل لگی، دل لگی نہیں ناصح   تیرے دل کو ابھی لگی نہیں ہے(۴۲)

زبان ہلاؤ تو ہو جائے گا فیصلہ دل کا   اب آچکا ہے لبوں پر معاملہ دل کا(۴۳)

داغ نے جہاں بھی محاورے کا استعمال کیا ہے وہ محاورہ گویا مصرے میں مدغم ہو کر رہ گیا ہے جیسے انگوٹھی میں نگینہ۔ مصرعے میں محاورے کی ادائی ایسی شستہ، رواں اور برجستہ برتی گئی ہے کہ شعر کے ساتھ محاورہ ضرب المثل بن گیا ہے۔ مثال کے طور پر مصرعے ملاحظہ کیجئے:

ع   بہت دیر کی مہرباں آتے آتے

ع   خود بخود غیب سے ہو جائے گا سامان کوئی

ع   جانے والی چیز کا غم کیا کریں

ع   رہتا ہے ایک پاؤں ہمارا رکاب میں

داغ نے محاورات کے بر محل استعمال کی تاکید اپنے شاگردوں کو بھی کرتے رہے۔ داغ کے نزدیک محاورے کو جوں کا توں استعمال کیا جانا چاہیے تا کہ محاورہ کے استعمال کا مقصد شعر کے خیال سے متعلق ہو کر خیال میں مدغم ہو کر پڑھنے والے پر اپنا تادیر اثر چھوڑے۔

داغ کے اشعار میں محاورات کی بُنت اور استعمال شدہ صورت کو دیکھ کر یہ گمان گزرتا ہے کہ داغ یہ کبھی نہیں چاہتے تھے کہ محاورے اپنے سیاق وسباق سے ہٹ کر اپنے انفرادی معنی برقرار رکھتے ہوئے شعر کے مجموئی حُسن کو ماند کر ڈالے۔ ایک خط میں عزیز شاگرد کو تنبیہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں ”: مجھ کو دیوان دیکھنے کی فرصت کہاں جو میرے مسلک کے خلاف ہو نکالو، البتہ ایک کھٹکا ہے کہ کوئی محاورہ خلاف (خیال و مدعا) نہ بندھا ہو۔“(۴۴)

محاورے کے استعمال کے لیے داغ کی احتیاط کا یہ عالم تھا کہ اگر ذرا بھی محاورہ کے بر محل استعمال نہ ہونے کا اندیشہ محسوس ہوتا تو اسے فوراً حذف کر دیتے اور اس سلسلے میں اپنے متعلقین سے مدد بھی لے لیا

کرتے تھے۔ایک خط میں امیر مینائی(۱۸۲۹ـ۱۹۰۰ء) کو لکھتے ہیں”:مرحومہ کی زبان اُردو پر بہت قابض تھیں۔اکثر محاورے میں مجھ جو(ان سے) مدد ملتی تھی۔“(۴۵)

داغ نے قلعہ معلیٰ کی ٹکسالی اور دہلی کی بولی ٹھولی کی زبان کو برمحل اور موزوں محاوروں سے اُردو شاعری میں جس انوکھے اور بے ساختہ پن میں استعمال کیا ہے وہ نہ صرف لائق داد ہیں بل کہ معیاری اور مستند اُردو زبان کے لیے بہ طور نمونے کی حیثیت بھی رکھتے ہیں۔روزمرہ اور محاورہ کا برمحل اور موزوں استعمال کے حوالے سے کسی لسانیاتی دست رس رکھنے والے متقدمین ومتاخرین شعرا نیزان کے ہم عصر شعرا کے نمونہ نظر نہیں آتا۔مرزا فرحت اللہ بیگ(۱۸۸۳ـ۱۹۴۷ء) مرزا داغ کے اس انفرادی وصف کے حوالے سے لکھتے ہیں:

” اس معاملے میں بڑی رائے جو ہے وہی سب کی ہے کہ جو زبان داغ نے لکھی ہے وہ شاید ہی کسی اور کے ہاں پورے قد اور لوازماتِ شعری سے موجود ہو۔ذرا زبان کی شوخی، مضمون کی ادائی اور طبعیت کی روانی دیکھیے:سازیہ کینہ ساز کیا جانیں ناز والے نیاز کا جانیں۔“(۴۶)

مرزا فرحت اللہ بیگ اپنے مضامین فرحت اللہ بیگ کے حوالے سے ہمیشہ یادرکھیں جائیں گے کہ انھوں نے مولوی نذیر احمد کی نثری روایت کو جس طرح دہلی کے ٹھیٹھ اورلب ولہجے میں خلق کیا ہے وہ لائق داد ہے۔داغ کی زبان مولوی نذیر احمد(۱۸۳۱ـ۱۹۱۲ء) اور ان کے ہم عصر دہلوی ادباء کی روایت کی ترجمان ہے اور بڑھاوا دیتی نظر آتی ہے۔اختر اورنیوی(۱۹۱۱ـ۱۹۷۷ء)داغ کی زبان کے حوالے سے لکھتے ہیں:

” داغ کی زبان دانی اس کے لہجے میں متنوع آہنگ کا احاطہ کیے ہوئے ہے جس سے فنی شعور کی پختگی اور شعری حسیت کا غائر ادراکی عنصر کُھل کر سامنے آتا ہے۔فقرہ باز اور پُرشکوہ انداز ہونے کے باوجود داغ کے کلام میں دلچسپی و دل بہلانے کا ممکنہ سامان موجود ہے جس سے کلام دوآتشہ ہو گیا ہے۔“(۴۷)

کلاسیکی غزل کی روایت قلی قطب شاہ (۱۵۶۶ـ۱۶۱۱ء) سے شروع ہو کر داغ سے ہوتی ہوئی حسرت موہانی(۱۸۷۸ـ۱۹۵۱ء)تک انجام کو پہنچتی ہے۔اس سارے سفر میں جہاں بڑے بڑے شعرا اپنے خیالات و افکار اور زبان کی یکتائی کا دعویٰ کرتے دکھائی دیتے ہیں وہاں داغ کا ذکر آتے ہی محاوروں اور روزمروں کا نقارہ بجتا محسوس ہوتا ہے۔یوں لگتا ہے جیسے محاروات کو داغ کی کلام و شخصیت کے ساتھ منسوب کر دیا گیا ہے۔

ساقی تو مجھ کو چاٹ لگا کر الگ ہوا　　دُھودُھو کے پی رہا ہوں پیالہ شراب کا(۴۸)

چھک گئے ہیں آج اِک ساغر سے ہم　　ہاتھ دھوئے بیٹھے مئے کوثر سے ہم(۴۹)

فراق گور کھپوری (۱۸۹۶۔۱۹۸۲ء) داغؔ کے بارے میں لکھتے ہیں ”:اُردو شاعری نے داغؔ کے برابر کا فقرہ باز آج تک پیدا نہیں کیا۔“(۵۰)

فقرہ باز اور شیوہ باز دو، ایسی خوبیاں ہیں جو شاذ ہی کسی ایک شاعر کے ہاں بہ یک وقت اکھٹی موجود رہی ہوں۔ داغ کی تعلیم وپرورش اور شعری تربیت چوں کہ قلعہ معلٰی میں اپنے زمانے کے ممتاز ترین شعرا و شار کے ہاں ہوئی تھی۔ اس انفرادی اعجاز کے پیشِ نظر انھیں جہاں اُردو زبان پر دسترس کا دعویٰ اور تفاخر حاصل تھا وہیں اُردو محاروات کے بر محل استعمال میں فنی پختگی کا احساس انھیں شاعرانہ تعلی پہ بھی اکستا تا تھا جس کا اظہار ان کے بیشتر اشعار میں دیکھا اور محسوس کیا جاسکتا ہے۔ یہ اشعار دیکھیں:

تری آتش بیانی داغؔ روشن ہے زمانے پر
پگھل جاتا ہے دل مثلِ شمع ہر اِک سخنور کا(۵۱)
اللہ اللہ تری شوخ بیانی اے داغؔ
سستا اِک شعر نہ دیکھا ترے دیوان میں کبھی(۵۲)
مدعی کوئی بھی میدانِ سخن میں نہ رہا
تو نے کیا معرکہ داغؔ سخنور مارا(۵۳)

اُردو زبان کا کوئی مورخ اس حقیقت سے انکار نہیں کر سکتا کہ داغ کا لافانی کارنامہ ان کی لسانی خدمات ہیں۔ زبان کے سلسلے میں کلامِ داغ اپنے اندر کچھ ایسی جداگانہ شعری صفات رکھتا ہے جن کی بِنا پر ہم داغ کو اپنے زمانے کا سب سے بڑا شاعر قرار دے سکتے ہیں۔ ان شعری صفات میں روزمرہ، محاورہ، سادگی و صفائی، بے ساختگی، اثر انگیزی اور الفاظ کی پیشکش کا اُستادانہ شعری اظہار؛ ایسے فکری وفنی اور لسانی اوصاف ہیں جس نے اُردو شاعری کی تنگ دامانی کو وسعت بکیر اس سے ہم کنار کر دیا۔ بہ قول داغؔ:

اُردو ہے جس کا نام ہمیں جانتے ہیں داغؔ
سارے جہاں میں دُھوم ہماری زبان کی ہے(۵۴)

اُردو زبان کا کوئی مورخ اس حقیقت سے انکار نہیں کر سکتا کہ داغ کا لافانی کارنامہ ان کی لسانی خدمات ہیں۔ فقروں اور محاوروں کے بے مثال جادو گر ہیں۔ کلاسیکی غزل میں جہاں داغ کا ذکر آتا ہے اُردو زبان کی فصاحت و بلاغت اور لسانیاتی اُپج کا تاثر رُخِ روشن کی طرح تابان و درخشاں نظر آتا ہے۔ اُن کا یہ کارنامہ شاعری کی دُنیا میں ہمیشہ یاد رکھا جائے گا۔ داغ نے زبانِ اُردو اور صنف غزل پر جو احسانات کیے ہیں۔ ان کی دائمی حیات کی بقا کے لیے کافی ہیں۔

داغؔ ہی کے دم سے تھا لطفِ سخن
خوش بیانی کا مزہ جاتا رہا(۵۵)

☆☆☆☆☆

حوالے

(۱) خلیق انجم، داغ دہلوی:حیات اور کارنامے، مرتبہ، کامل قریشی، (دلی: اُردو اکادمی، ۲۰۰۳ء)،۱۶۔
(۲) تمکین کاظمی، داغ، (لاہور: آئینہ ادب، ۱۹۶۰ء)،۲۶۔
(۳) مرزا داغ، کلیات داغ، (لاہور: عبد اللہ اکیڈمی، ۲۰۱۷ء)،۳۹۷۔
(۴) مرزا داغ، گلزار داغ،۲۹۶۔
(۵) تمکین کاظمی، داغ،۲۶۔
(۶) شوکت سبزواری، مشمولہ، مضمون: داغ کی معاملہ بندی، نگار داغ نمبر ، جنوری،۱۹۵۳،۱۱۲۔
(۷) مرزا داغ، مہتاب داغ،۴۸۹۔
(۸) مرزا داغ، مثنوی فریاد داغ،۳۱۲۔
(۹) ایضاً،۳۶۳۔
(۱۰) احسن مارہروی، مہتاب داغ،۱۵۔
(۱۱) ایضاً،۲۶۔
(۱۲) جمیل جالبی، تاریخ ادب اُردو، جلد چہارم، (لاہور: مجلس ترقی ادب،۲۰۱۵ء)،۱۴۸۷۔
(۱۳) مرزا داغ، گلزار داغ، ۳۲۔
(۱۴) علامہ اقبال، کلیات اقبال، (دلی: مرکزی مکتبہ اسلامی،۱۹۹۷ء)،۷۳۔
(۱۵) نور الحسن ہاشمی، دلی کا دبستان شاعری، کراچی: انجمن ترقی اُردو پاکستان،۲۰۰۸ء)،۹۵۔
(۱۶) نور اللہ محمد نوری، نواب فصیح الملک بہادر داغ دہلوی، (لاہور: اعظم اسٹیم پریس، حیدرآباد، ۱۹۳۶ء)، ۱۳۹۔
(۱۷) اعجاز حسین، داغ ترجمان راہنمائے اُردو، مشمولہ: نگار داغ نمبر، (لکھنؤ: نگار بک ایجنسی، ۱۹۵۳ء)،۱۸۔

(۱۸) مرزاداغ دہلوی، کلیات داغ،گلزار داغ، (عبداللہ اکیڈمی،۲۰۱۷ء)،۲۴۰۔
(۱۹) مرزاداغ دہلوی، کلیات داغ، آفتاب داغ،۳۱۴۔
(۲۰) رفیق مارہروی، زبان داغ، (نسیم بک ڈپو،۱۹۵۶ء)،۲۱۸۔
(۲۱) مرزاداغ دہلوی، کلیات داغ، گلزار داغ،۲۶۶۔
(۲۲) رام بابو سکسینہ، تاریخ ادب اُردو،۳۷۲۔
(۲۳) احسن مارہروی،انشائے داغ،مقدمہ، (انجمن ترقی اُردو ہند،۱۹۴۱ء)،۳۱۔
(۲۴) مرزاداغ دہلوی، کلیات داغ، یادگار داغ،۶۹۵۔
(۲۵) ایضاً، کلیات داغ،مہتاب داغ،۴۵۰۔
(۲۶) ایضاً، کلیات داغ،گلزارداغ،۲۱۸۔
(۲۷) ایضاً،۲۴۰۔
(۲۸) مرزاداغ دہلوی، کلیات داغ، یادگارداغ،۶۹۶۔
(۲۹) ایضاً، کلیات داغ،گلزارداغ،۱۹۷۔
(۳۰) ایضاً،۲۰۴۔
(۳۱) مرزاداغ دہلوی، کلیات داغ،مہتاب داغ،۴۰۵۔
(۳۲) ایضاً، کلیات داغ،گلزار داغ،۸۴۔
(۳۳) ایضاً، کلیات داغ، آفتاب داغ،۳۳۵۔
(۳۴) ایضاً، کلیات داغ،مہتاب داغ،۵۳۸۔
(۳۵) ایضاً، کلیات داغ،مہتاب داغ،۵۰۱۔
(۳۶) حامد حسن قادری، کمال داغ، (آگرہ:اخبار پریس آگرہ۱۹۳۴ء)،۱۰۹۔
(۳۷) شوکت سبزواری، مشمولہ، مضمون: داغ کی معاملہ بندی، نگار داغ نمبر ،۱۲۸۔
(۳۸) مرزاداغ دہلوی، کلیات داغ،گلزارداغ،۸۷۔
(۳۹) ایضاً،۱۴۱۔
(۴۰) ایضاً،۳۳۔
(۴۱) مرزاداغ دہلوی، کلیات داغ، یادگارداغ،۳۵۷۔
(۴۲) ایضاً، کلیات داغ، آفتاب داغ،۳۱۹۔
(۴۳) ایضاً، کلیات داغ،مہتاب داغ،۳۸۴۔
(۴۴) رفیق مارہروی،زبان داغ،۱۱۷۔
(۴۵) ایضاً،۱۱۹۔
(۴۶) فرحت اللہ بیگ، دہلی کی آخری شمع،مرتبہ، صلاح الدین،(دہلی:اُردو اکادمی دہلی،۲۰۰۳ء)،۱۳۲۔
(۴۷) اختر اورنیوی، داغ کی شاعری میں لب ولہجہ کی اہمیت، نگار داغ نمبر ،۹۷۔

(۴۸) مرزاداغ دہلوی، کلیات داغ، مہتاب داغ، ۳۸۴۔

(۴۹) ایضاً، کلیات داغ، گلزار داغ، ۱۲۰۔

(۵۰) فراق گورکھ پوری، داغ، نگار داغ نمبر، ۹۹۔

(۵۱) مرزاداغ دہلوی، کلیات داغ، مہتاب گلزار داغ، ۴۱۵۔

(۵۲) ایضاً، کلیات داغ، آفتاب داغ گلزار داغ، ۳۲۰۔

(۵۳) ایضاً، کلیات داغ، گلزار داغ گلزار داغ، ۹۷۔

(۵۴) ایضاً، کلیات داغ، یادگار داغ گلزار داغ، ۱۵۷۔

(۵۵) ایضاً، کلیات داغ، آفتاب داغ گلزار داغ، ۲۸۵۔

BIBLIOGRAPHY

- Ahsan Mahervi, *Insha'y Dāgh*, Muqadama, (Karachi: Anjuman Taraqi Urdu, 1941)
- Dagh Dehlavi, *kulliyāt-i Dāgh*, (Lahore: Abdullah Academy, 2017)
- Ejaz Hussain, Dagh Tajuman Rahnuma'y Urdu, (Incl.) *Nigār Dāgh Number*, (January, 1953)
- Jameel Jalbi, *Tarīkh Adab Urdū*, (Lahore: Majlis Traqhi Adab, June 2015)
- Khaleq Anjum, *Dāgh Dehlavī: Hayāt aur Kārnāmen*, (Comp.) Kamil Qureshi, (Delhi: Urdu Akademi, 2003)
- Mirza Farhatullah Baig, *Delhī kī Ākhrī Shammah*, (Delhi: Urdu Academy, 2003)
- Muhammad Iqbal, Allama: *Kuliyāt-i Iqbal*, (Delhi: Central Islamic School, Delhi, 1997)
- Noor al-Hasan Hashmi, *Dellī kā Dabistān Sha'ari*, (Karachi: Anjuman Taraqi Urdu, 2008).
- Noorullah Muhammad Noori, *Navāb Fasīh al-Mulk Bahādur Dāgh Dehlavī*, (Hyderabad, Azam Steam Press, 1936)
- Rafiq Mahiruri, *Zubān-e Dāgh*, (Naseem Bukidpo, 1956)
- Ram Babu Sacsena, *Tarīkh Adab Urdū*
- Shaukat Sabzwari, Dagh ki Mu'ala Bandi, (Incl.) *Nigār Dāgh Number*, (January, 1953)
- Tamkin Kazmi, *Dāgh*, (Lahore: Aina Adab, 1960)

❖❖❖